

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## اشارات

ہمارے موجودہ صدر مملکت زبان کے استعمال کے معاملے میں تو مطلق العنان ہیں ہی، اس لیے ان کی زبان فیض ترجمان سے گفتنی اور ناگفتنی ہر طرح کی باتیں نکلتی رہتی ہیں۔ مگر مٹی کے آخر میں انہوں نے مغربی جوہنی کے ایک اخبار نویس کو جو تفصیلی انٹرویو دیا ہے اس میں ایک بات ایسی کہی ہے جو دینی اور قومی نقطہ نظر سے سخت قابل اعتراض ہے۔ ہم صدر صاحب کے اس مزاج کو جاننے کے باوجود کہ وہ ترنگ میں آکر بعض اوقات بڑی عجیب و غریب باتیں کر جاتے ہیں، جن کے بارے میں وہ قطعی طور پر سنجیدہ نہیں ہوتے، مضطرب ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے سیاسی اور معاشی عزائم کے اظہار کے لیے ایک ایسی اصطلاح استعمال کی ہے جو ہمارے نزدیک بڑی معنی تیز ہے۔ اس سے پیشتر وہ اپنے ان عزائم کو سوشلزم کے لفظ سے ظاہر کیا کرتے تھے اور کبھی اسے مشرف باسلام کر کے اسلامی سوشلزم کہہ دیتے تھے۔ لیکن اب کی مرتبہ انہوں نے یہ اصطلاح ترک کر کے مارکسزم کی اصطلاح استعمال کی ہے اور اس کے ساتھ قوم کو یہ ”مژدہ“ بھی سنایا ہے کہ وہ اسلام کے معتقدات اور اس کی روایات کے ساتھ مارکسزم کی پیوند کاری کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اُن کے اس عزم کو دیکھتے ہوئے انسان کے ذہن میں بالکل ناگزیر طور پر دو احساسات اُبھرتے ہیں۔ پہلا یہ کہ اُن کی نگاہ میں اسلام معاذ اللہ ایک نامکمل ضابطہ حیات ہے جو اپنی تکمیل کے لیے مارکسزم کی پیوند کاری کا محتاج ہے، کیونکہ اگر وہ اسے مکمل ضابطہ حیات سمجھتے تو پھر انہیں اسلام کے دینی معتقدات کے ساتھ کارل مارکس کی سیاسی اور معاشی تعلیمات کو جوڑ کر دینِ حق کو مکمل کرنے کی قطعاً ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ دوسرے احساس کے اُبھرتے ہی صاحبِ صدر کی بصیرت اور اُن کی معاملہ فہمی مشتتبہ ہو جاتی ہے۔

وہ دین کے عالم نہ سہی، مغربی یونیورسٹیوں کے تربیت یافتہ تو ضرور ہیں۔ ان یونیورسٹیوں میں ایک طویل مدت گزارنے کے بعد ان کے اندر انہی بصیرت نو پیدا ہو جانی چاہیے تھی کہ وہ اس سادہ سی حقیقت کو سمجھ سکیں کہ اول تو دو الگ نظاموں کے مابین، جو حیات انسانی کے سارے گوشوں پر محیط ہوں، کسی قسم کی پیوند کاری کوئی مفید نتائج برآمد نہیں کر سکتی۔ لیکن خاص طور پر دو ایسے نظام ہاتے حیات جو اساسی تصورات سے لیکر زندگی کی عملی جزئیات تک کے معاملے میں ایک دوسرے سے نہ صرف مختلف ہوں بلکہ ایک دوسرے کی ضد ہوں، کے مابین کوئی جوڑ لگا کر کسی مفید نتیجہ کی توقع کرنا سراسر خام خیالی ہے۔

کون نہیں جانتا کہ اسلام ایک ایسا مکمل اور ہمہ گیر ضابطہ حیات ہے جو پورے کا پورا خدا پرستی کی بنیاد پر استوار کیا گیا ہے۔ اس کے معتقدات، اس کا نظام اخلاق، اس کا نظام معیشت و معاشرت اور اس کا نظام سیاست، الغرض زندگی کے سارے شعبے عقیدہ خدا پرستی کا عکس پیش کرتے ہیں۔

اسلام کے مقابلے میں مارکسزم ایک ایسا ضابطہ حیات ہے جو اول تا آخر مادیت پرستی کی اساس پر قائم ہے۔ اس میں مادہ ہی کو تخلیق کی علت اولیٰ قرار دیکر فکر و عمل کے سارے ڈھانچے تیار کیے گئے ہیں۔ اس نظام کی رُو سے مادہ کے سوا اس کائنات کا کوئی خالق و مالک نہیں۔ اس وجہ سے خدا، خدائے شمس و زحل و الہام سب تو بہات کا درجہ رکھتے ہیں۔ انسان کا مادی ماحول، جسے مارکس ذرائع پیداوار کا نام دیتا ہے، انسانی شعور اور اخلاق کی صورت گری کرتا ہے۔ ان ذرائع کی تبدیلی سے نہ صرف معیشت میں تبدیلی ہوتی ہے بلکہ اخلاق، معاشرت، قانون، سیاست، الغرض انفرادی اور اجتماعی زندگی کا پورا ڈھانچہ ان کے مطابق بدل جاتا ہے۔ اس نظریے کی بنا پر دنیا کا کوئی اصول، خیر و شر کا کوئی پیمانہ بھی مستقل قدر و قیمت کا حامل نہیں بلکہ معاشی تبدیلیوں کے ساتھ یہ اصول اور پیمانے مسلسل بدلتے رہتے ہیں۔ اسی طرح حق و ناحق، خوب و ناخوب کا بھی کوئی قطعی اور حتمی معیار نہیں۔ ذرائع پیداوار انسانوں کے مابین جن معاشی روابط کی تشکیل کر دیں وہی ایک خاص وقت میں حق و انصاف کے معیارات قرار پاتے ہیں۔ اور ان ذرائع میں تغیر کی وجہ سے جو نئے روابط معرض وجود میں آئیں وہی دوسرے وقت حق و صداقت کے پیمانے بن جاتے ہیں۔

مارکس کے نزدیک تو خیر مذہب انسانیت کے لیے ایفون ہی ہے۔ لیکن اس کے وہ پیرو جنہوں نے مذہب و شمنی میں کسی قدر اعتدال پسندی کا ثبوت دیا، ان کے نزدیک بھی اگر کوئی مذہب کسی قدر

قیمت کا حامل تھا تو وہ ایک خاص عہد اور ماحول میں تھا جس کے بدل جانے سے اُس کی افادیت یکسر ختم ہو گئی ہے۔ چنانچہ ان کی تحریروں میں اسلام کا ذکر بھی اسی انداز سے آیا ہے کہ حضور سرکارِ عالم کے عہد میں عرب سماج کے معاشی ڈھانچے میں جو تغیرات پیدا ہو رہے تھے حضور نے ان کا اچھی طرح اور رک کر کے اُن کے تقاضوں کے مطابق عرب سوسائٹی کے اندر تبدیلیاں پیدا کر دیں۔ اور یہی ان معتدل سوشلسٹوں کے نزدیک حضور کا اصلی کارنامہ ہے۔ اُن کے ان مذموم خیالات کو دوسرے نقطوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک کے لیے خداوند تعالیٰ کے منشا کو انسانیت پر واضح کرنے والے نہیں بلکہ اپنے دور کی عرب سوسائٹی کے ”انقلابی قائد“ تھے، جنہوں نے معاشی میدان میں چند تبدیلیاں لاکر اُس زمانے کے حالات کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔

اسلام کے بارے میں اس قسم کے خیالات پر غور کیجیے اور دیکھیے کیا کوئی شخص انہیں قبول کر کے مسلمان رہ سکتا ہے؟ جو ”ازم“ اس بات کا دعویدار ہو کہ ہر دور کا اپنا الگ ”قرآن“ ہے اور جس کے نزدیک کسی نظریے اور عمل کی صحت کا سارا دار و مدار صرف اس بات پر ہے کہ وہ پیداوار کے اندر تغیرات کے ساتھ بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہو، وہ ازم کسی ابدی پیغام یا کسی ابدی سچائی اور صداقت کا کس طرح علمبردار بن سکتا ہے؟

ہمیں اس وقت اس امر سے کوئی بحث نہیں کہ جو لوگ اس نظریہ کے حامی ہیں وہ خود اس کے کہاں تک پابند ہیں۔ ہمیں تو یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ایک مسلمان جس کا ایمان یہ ہے کہ اسلام انسانیت کے نام خدا کا پہلا اور آخری پیغام ہے اور جس میں قیامت تک کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہ آخری پیغمبر ہیں جن کے ذریعہ قادر مطلق نے اپنے اس پیغام کے مضمرات قیامت تک حتمی صورت میں واضح کر دیئے، اس بنا پر حضور کی نبوت اصلاحِ معیشت کی کوئی عارضی اور وقتی تحریک نہیں بلکہ ہمہ گیر ہدایتِ الہی کا واحد سرچشمہ ہے، وہ اشتراکی خرافات پر کس طرح ایمان لاسکتا ہے؟ جو لوگ اس قسم کے باہم متضادم معتقدات کو ایک دوسرے کے ساتھ پویست کر کے ایک مخلوط بنانے کی کوشش کرتے ہیں وہ یا تو ناٹری ہیں یا پھر مروج القلم۔

اسلام کے خلاف ماضی میں بھی اعتراضات ہوتے رہے ہیں مگر ان کی نوعیت زیادہ ترکلامی مسائل کی سی تھی۔ لیکن دورِ حاضر میں جس قدر اعتراضات ہو رہے ہیں اور اسلامی تعلیمات کے بارے میں ذہنوں میں جو شکوک و شبہات پیدا کیے جا رہے ہیں وہ بیشتر تاریخ کی مادی تعبیر کی پیداوار ہیں۔ ان اعتراضات کی ساری عمارت اس غلط مفروضے پر اٹھاتی گئی ہے کہ معاشی ماحول کے بدل جانے سے حق و صداقت کے معیارات بدل جاتے ہیں۔ چنانچہ اسلام پر اعتراضات کا اگر وقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو آپ ان کی تہ میں یہی غلط مفروضہ کار فرما پائیں گے ہم یہاں چند اعتراضات بطور مثال نقل کرتے ہیں۔

اسلامی تعلیمات کو وقتی اور عارضی اور دورِ حاضر کے لیے بیکار ثابت کرنے کی غرض سے یہ کہا جاتا ہے کہ آخر یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ کسی قدیم معاشرے کے اصولوں کو دورِ جدید کی ترقی یافتہ اور جدید سوسائٹی پر ٹھونسنے کی کوشش کی جاتے؛ اپنے اس اعتراض کے اندر وزن پیدا کرنے کے لیے یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ وہ لباس جو ایک چھوٹے بچے کے لیے تراشا جاتے وہ ایک جوان آدمی کے جسم پر کس طرح رہ سکتا ہے اور اگر کوئی شخص ایسی کوشش کرے تو اس کے خاتمہ نقل ہونے پر کسے شبہ ہو سکتا ہے؛ دوسرے سارے اعتراضات و حقیقت اسی اعتراض کی مختلف فروعات ہیں۔ مثلاً اسلامی نظام ۳۰ سال تک کامیابی کے ساتھ چلا اور پھر انتشار کی نذر ہو گیا۔ اس اعتراض میں جو کچھ باور کرنا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ ۳۰ سال کے عرصے میں عرب کے اندر جو معاشی تبدیلیاں آئیں انہوں نے اس نظام کی افادیت کو ختم کر دیا اور معاشی تغیرات کی وجہ سے ایسے نئے تقاضے ابھرے جو کسی نئے دین کے طالب تھے۔ اس کے علاوہ اسلام کو یہ بھی طعنہ دیا جاتا ہے کہ یہ بادشاہوں کی پشت پناہی کرتا ہے اور جاگیر داری اور سرمایہ داری کے لیے ڈھال کا کام دیتا ہے۔

اس طعنہ زنی کا مقصد یہ ہے کہ نوجوان نسل کے ذہن میں یہ باطل خیال بٹھا دیا جائے کہ اسلام ایک ایسا رجعت پسندانہ نظام ہے جسے دنیا کے ظالموں نے استحصال اور نا انصافی کے لیے بطور آلہ استعمال کیا اور اب تک کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس دین کو اللہ تعالیٰ نے انسان کی رہنمائی کے لیے نازل نہیں فرمایا بلکہ جاگیر داروں اور سرمایہ داروں نے استحصال اور اپنے ناجائز مفادات کے تحفظ کے لیے گھڑا ہے اور وہی آج تک اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اس طنز میں ایک طرف تو اس دین کے بارے میں بوسیدہ اور ازکار رفتہ ہونے کا تاثر قائم ہوتا ہے اور دوسری طرف یہ باطل

نقش بھی دل و دماغ پر ثبت۔ ہونا ہے کہ یہ دین آزادی، روشن خیالی، عدل و انصاف کا دشمن اور ظلم و استبداد کا موید اور حامی ہے؟

تاریخ کی مادی تعبیر جس کی اصل سے اعتراضات کی یہ ساری فروعات بھڑکتی ہیں، انسانیت اور انسانی ارتقاء کے نہایت گمراہ کن مطالعہ پر مبنی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ معاشی حالات میں تغیر و تبدل سے معاشرتی زندگی بھی بعض اثرات قبول کرتی ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کر لینا کہ ذرائع پیداوار ہی کسی معاشرے کے سیاسی، معاشرتی اور مذہبی تصورات کی صورت گری کرتے ہیں بہت بڑی جہالت ہے۔ اگر مارکس کے اس دعوے کو صحیح مان لیا جائے تو پھر ان تمام معاشروں میں فکر و عمل کی پوری ہم آہنگی پائی جانی چاہیے جن میں ذرائع پیداوار ایک قسم کے ہیں یا جو معاشی اعتبار سے ارتقاء کی ایک خاص سطح پر ہیں۔ لیکن تاریخ کے اوراق نہ صرف یہ کہ اس دعوے کی تصدیق نہیں کرتے بلکہ اس کی پُر زور تردید کرتے ہیں۔ اہل روم اور قرن اول کے مسلمان معیشت کے ایک ہی دور میں تھے مگر ان کے افکار و نظریات، ان کے اخلاقی معیارات، ان کے خوب و ناخوب کے پیمانوں اور ان کے معاشرتی اور سیاسی ڈھانچوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ان کی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جس میں کسی قسم کی مماثلت پائی جاتی ہو۔ دونوں ہر لحاظ سے ایک دوسرے کی ضد تھے۔ اس تضاد کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ قوموں اور افراد کی تعمیر میں فیصلہ کن قوت معاشی نہیں بلکہ وہ مقاصد ہیں جن کے حصول کے لیے وہ جدوجہد کرتے ہیں۔ مقاصد کا اختلاف ان کے طرز عمل اور طرز فکر میں اختلاف پیدا کر دیتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ زندگی کے خارجی مظاہر خصوصاً اس کے معاشی حالات کسی قوم کے فکر و عمل کا ہیروئی تیار نہیں کرتے بلکہ اس کے عزائم اور مقاصد اس کی زندگی کی تشکیل کرتے ہیں۔

پھر اسلامی نظام کو لباس پر قیاس کر کے یہ فیصلہ صادر کر دینا کہ چونکہ بچپن کا لباس جوانی میں بیکار ہوتا ہے۔ اس لیے ہر وہ نظام حیات جس کا ماضی سے تعلق ہے وہ حال کے لیے بے سود ہے بلکہ مضر رساں ہے، قیاس مع الفارق ہے۔ اسلامی نظام حیات اور لباس میں کوئی چیز بھی مشترک نہیں، بلکہ اسے اگر انسانی زندگی کے کسی حق سے تشبیہ دی جاسکتی ہے تو روح ہے جس طرح روح انسان

کے ساتھ برابر جاری و ساری رہتی ہے اور وہ کسی مرحلے پر بھی فرسودہ اور بیکار نہیں ہوتی۔ اسی طرح اللہ کا دین بھی بر عہد اور ہر دور میں انسان کی پوری طرح رہنمائی کرتا ہے۔ وہ کبھی بوسیدہ نہیں ہونے پاتا۔ اس بات کی ضرورت البتہ ہر منزل پر رہتی ہے کہ رُوح کی طرح اللہ کے دین کو بھی ہر قسم کی آلودگی سے پاک رکھا جائے، تاکہ وہ پوری قوت کے ساتھ انسانی جسم کی توانائیوں کو کسی اچھے کام میں لگا سکے۔

اسی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو جتنا تاریخی تسلسل اللہ کے دین میں پایا جاتا ہے کسی دوسرے نظریہ حیات میں نہیں دیکھا جاسکتا۔ جو لوگ مذہب یا کسی نظام حیات کو لباس پر قیاس کر کے انسانی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں ان کے نزدیک ماضی کی ہر چیز واقعی عیبست اور بیکار ہے لیکن جو لوگ ہدایت الہی کو انسانیت کے لیے بمنزلہ رُوح سمجھ کر اس کے ارتقاء کا جائزہ لیتے ہیں، وہ پوری تاریخ کو حق و باطل کی ایک نہ ختم ہونے والی کشمکش پاتے ہیں جس میں انسان ماضی سے سبق اور عبرت حاصل کرتا ہے کیونکہ ماضی ہی میں اللہ تعالیٰ نے اُن بزرگ و بزرگ ہستیوں کو دنیا میں مبعوث فرمایا جنہوں نے اس کشمکش میں مثالی کردار ادا کیے انسانیت کو یہ بتایا کہ حق کی کس طرح حمایت کرنی چاہیے اور باطل کے خلاف کس عزم، ہمت اور تدبیر سے صفت آرا ہونا چاہیے۔

تاریخ کی مادی تعبیر پر ایمان رکھنے والوں کے لیے تو ممکن ہے کہ انہیں ماضی میں سوائے جہالت اور استحصالی کے اور کچھ نظر نہ آتا ہو لیکن وہ قوم ماضی کو کس طرح نظر انداز کر سکتی ہے جسے ان گزرے ہوئے ادوار میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں انسانیت کا سب سے ارفع اور اعلیٰ نمونہ ملا ہو اور جس کی پیروی کر کے ہی اس نے زندگی کے ہر گوشے میں غیر معمولی طور پر نمایاں کامیابیاں حاصل کی ہوں۔ اس قوم سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ ماضی کی طرف دیکھنا چھوڑ دے بہت بڑی حماقت ہے۔ تاریخ درحقیقت انسانی حافظے کا دوسرا نام ہے۔ اُس شخص کے لیے تو بلاشبہ یادِ ماضی عذاب ہے جو اپنے حافظے میں سوائے گھناؤنے جرائم کے اور کوئی چیز محفوظ نہیں پاتا لیکن وہ شخص اپنے ماضی کو کس طرح بھلا دینے پر آمادہ ہو سکتا ہے جس کے حافظے میں پاکبازی، شرافت، دیانت، عدل و انصاف اور خدمتِ انسانیت کی لاتعداد قدیمیں فروزاں

ہوں۔ ان قندیلوں کی روشنی سے تو وہی شخص خوف زدہ ہو کر انہیں شعور کی نظروں سے اوجھل رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ جس کی فطرت منح ہو جانے کی وجہ سے پاکبازی کے مقابلے میں ہوسناکی سے، شرافت کے مقابلے میں رذالت سے، عدل و انصاف کے مقابلے میں ظلم و استبداد سے اور خدمتِ انسانیت کے مقابلے میں عیاری چالاکی اور زیر دست آزاری سے ایک گہرا لگاؤ پیدا ہو چکا ہو۔ اسلام نے مسلمانوں کے شعور میں تاریخی تسلسل کے جو گہرے اثرات مترتب کیے ہیں ان کے نقوش اسلامی تہذیب اور معاشرت کے ہر گوشے میں نہایت واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ ہم یہاں صرف قانون سازی کے دائرے میں ان اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے ہاں آزادی اور اصلاحِ احوال کی بے شمار تحریکات نے مختلف ادوار میں جنم لیا، لیکن کبھی بھی ان کے ہاں یہ سوال زیر بحث نہیں آیا کہ آزادی کے بعد یا اصلاحِ احوال کی کسی تحریک کے کامیاب ہو جانے کے بعد وہ کن مقاصد کی تکمیل کریں گے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ ان کے مقاصد روز اول سے متعین ہیں اور مسلم سوسائٹی کے ہر فرد کے قلب و دماغ کی لوح پر یہ مقاصد اسی وقت ثبت ہو جاتے ہیں جب وہ دنیا میں آنکھ کھولتے ہی اذان کی آواز سنتا ہے۔

باقی ممالک کو تو فی الحال جانے دیجیے، صرف اس نیم تبرا عظیم کی تاریخ پر نگاہ ڈال کر دیکھیے کہ مسلمانوں میں اصلاحِ احوال کے لیے کتنی تحریکیں اُبھریں۔ ان تحریکوں کے طریقائے کار میں بھی نمایاں اختلافات تھے۔ لیکن ان کے مقاصد میں کبھی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ ان سب کے پیش نظر ایک ہی مقصد تھا کہ مسلمانوں کی زندگی ہر لحاظ سے اُس نقشے کے مطابق مرتب ہونی چاہیے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ خود تحریکِ پاکستان اسی ایک مقصد کی تکمیل کے لیے شروع ہوئی اور پروان چڑھی۔ اور قیامِ پاکستان کے بعد پوری قوم نے قراردادِ مقاصد کی صورت میں اس حقیقت کو آئینی طور پر تسلیم کیا کہ مسلمانوں کے الگ خطہ ارضی کے مطالبہ کا مقصد صرف ایک ہی تھا کہ وہ اس ملک میں اسلامی نظام کو برگ و بار لاتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔ پچھلے دنوں عدالتِ عظمیٰ نے جو معرکہ الآرا فیصلہ صادر کیا ہے اس میں بھی فاضلِ مجبور نے اس بات کی واضح نشاندہی کی ہے کہ قراردادِ مقاصد اس ملک کی اصل سمت ہے جس طرف اُسے بڑھنا چاہیے۔ اس بنا پر آج جو کوئی بھی اسلامی نظام کے نصب العین سے انحراف کرتا ہے۔ وہ درحقیقت اس ملک اور اس قوم کا سب سے بڑا بدخواہ ہے۔

(باقی صفحہ پر)